

مات بک رشیدہ روتنی رہی۔ بار بار نام تھوڑا کہتی: دیکھ مجھے تیری مسروت ہے تجھے میری  
بچپنے چارہ کیا کیا کرے گا ایسے خالموں میں آگئے۔ پہلی بار مجھے سمجھا آئی گہ وہ سب کچھ جانتی ہے۔  
اس کے گھروالے۔ اس کے برا دری دا لے..... میں نے دل میں سوچا کہ یہ اپنے بچپنے کے پیار میں  
پوری ارزش کیتی ہے تو میں اس کے پیار میں پورا کیوں نہیں اتر سکتا۔ میری خاطر کبھیں صفت کی تھیں  
سننی پھرے۔ کیوں اپنے بچپنے سے جدا ہے بے چاری؟

”اس کمینی کو بے چاری نہ کہ۔“

”آدمی رات کو میں اٹھا۔ وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ بڑی دیر میں دبھا میں رہا۔ پھر زی  
نے سوچا یہ کیوں سمجھوتے کرتی پھرے میرے نے۔ میں ہی کیوں نہ آخری بار سمجھوتہ کر دوں کار پورہ شن کی  
گندگاڑی کے ساتھ۔“

وہ آہستہ سے اٹھا اور جھاڑوٹو کری لے کر تیجو کے پاس سے اٹھ گیا۔

گلزار کے آتے ہی سور دپے لانگنے والا بہزی فوش بھی گایا۔ گلزار کے پاس ایک ڈینا ہوا دل  
تو قتا۔ لیکن اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بڑی دیر تک تسلک کے ساتھ زین کھو دتا۔ پھر زندیر نے  
اسے ماں بہن کی گاہیاں دینی شروع کر دیں۔

”ندیرا بھرا بھر کر کہہ رہا تھا۔“

”رشیدہ ماچپن سے ادھر کوئی ماں تجھے نہیں ملتی تھی کم ذات۔ کوڑھ کلی ہو کر شتیروں سے  
چھپاں ڈلنے کا نیت تھا دیکھا۔ جہنی انہیں پتہ چلا کیسے بچپن دل پر ڈنڈے مار کر نکال ہگایا۔ تجھے تو  
دس سال کی تید ہونی چلے ہئے کہتے۔“

گلزار مسکرا تاہماں اٹھا مسکرا تاہماں اگے بڑھا اور پھر زندیر کے کئے پر مکہ مار کر بولا: ”دھی دیا  
سور دپے ہی، ہی نا۔ دیوں گا مر اکیوں جاتا ہے۔“

”ندیر اس وقت چپ چاپ چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اردو گرد کسی کو پتہ چلے کر گلزار نے  
اسے اڑاہے لیکن بات ساری سڑنے میں یوں پھیلی گو با پھیلے ہوئے دھاون میں سے چونچے چونچے بھر

ان گفت چڑیاں چاروں گھونٹ لے جائیں۔ نذریکہ اس کے دوستوں نے خوب ٹھٹھ کیا۔ داد بھتی! اچھا جو ان ہے تو بھی پھر بڑے سے ملکہ کھا آیا۔ سارا دن نذریکھونزار ہا۔ آدمی رات کو رشیدہ کا گلزار تجوہ کا گلزار میک اتنا چار پانچ یہ آنسو بھاتا اوندھا لیٹھا سو گیا تو نذریمنہ پر کپڑا باندھے آیا اور اس چاپکدستی سے گلزار کی پیٹھ میں چھڑا گھونپنا کہ آنکھیں کھو لئے تھے گلزار کے دیدوں کی دلک ماری گئی اور وہ گندگاڑی جیسا بے وقت ہو گیا۔

جس روز میں ڈھاکر گیا ہوں اس مقدمے کی پیرودی کا پہلا دن تھا۔

تبخوا کے ہاتھ میں نذری کی مارچ تھی وہ اسے جلدی میں گلزار کے پنک پر ہی بھول گیا تھا۔

وہ بار بار شاپ چھبے لھا کر کہتی ہے:

"مرکار! ایکیے مکرے گا نذری۔ میں نے عدالت میں جب یہ مارچ پیش کی تو پھر کیمے مکرے گا۔ مجھریٹ پھانسی لگادے گا کہترے پیر۔"

تبخوا کو علم نہ تھا کہ قانون اور القacet دو یہ دھیزیں، میں اور ایک سے دوسرے شکر کوئی ایسا پل آجھ کھکھ تعمیر نہیں ہوا جس پر ہر طبقہ کا اوتی چل کر اپنی منزل پائے۔ ڈھاکہ سے دو ایک خطوں میں تجوہ کے مقدمے کے مقعی میں نے پوچھا تھا میکن پہنچا کہ پیشیاں چل رہی تھیں۔

میرے سامنے ۱۹۴۰ کا یمندر پھر بڑا ہے اور تجوہ حسب سابق ملکی مارہی ہے۔

"بچیاں آیا۔ تیرے بغیر تو یہ گھر کاں کو ٹھوڑی تھا۔ کرم کیا کرنی والے نے بو تیرامنہ دکھایا۔"

"تبخوا، تیرے گلزار کا کیا بتا۔"

تبخونے ملکی چھوڑ دی اور ملباس انہی بھر کروی۔ "مرنے والے کے ساتھ کون مرتا ہے مرکار۔ یہ بھی روٹی بھی کھاتا ہے۔ سہنا برتا بھی ہے۔ کون" تکہے مرنے والے کے ساتھ۔

"مقدمے کا کیا بتا تجوہ۔"

"بننا کیا تھا مرکار۔ سخت آدمی کا سچی بہماں مٹھا ہوتا ہے۔"

تبخوں کی سانس لے کر چھپ ہو گئی۔

”کیا ہو امتدے مے کار نذری کو پھانسی کا حکم ہوا کہ تو نے اسے علنا کر دیا۔  
”کیا سرکار میں تو اے جنم جنم معاف نہ کروں پرمیں نے کجھوتہ کر لیا نذری کے ساتھ۔  
اس نے دھکی جو ایسی دی تھی۔  
”کسی دھکی۔“

”نذری ساری سارائے میں کتنا پھرتا تھا۔ اب گلزار کو ختم کیا دسری بار سردار سے کو ختم کر دو گا  
..... مرنے والا تو مر گیا۔ اب سردار سے اتھے دھون میٹھی۔ بد ریئنے کی وجہ میں شہ نہیں۔ معاف  
میرا دل نہیں کرتا۔ میں کجھوتہ نہ کرتی تو کیا کرفی سرکار۔“  
میں چپ ہو گیا۔

”کجھوتہ کرنے والی آہستہ آہستہ ناکی بھیرتی رہی۔“

میرے سامنے گلزار کا سارا د جود گھوم رہا تھا۔ سفید سفید چادر پسند گھنے میں لکھنا اور سرمنے  
کے بین لگاتے ایک بار وہ کرنس کے دن مجھے سلام کرنے آیا تھا۔ گلزار جو بڑا رن پھوڑ دہنے  
کی طرح اکڑا ہوا جھاڑو کے نکلنے جیسا سخت تھا۔ دمرے پنجے کی جان پچنے کو اس پسلے پنجے کا  
قتل پی گئی۔

”یہ کجھوتہ کیا چہرہ ہے!“

”اپنی ناظر قسم کا احساس ہے۔“

”کر پنجے کچھے سرمایہ کا تحفظ!“

”وہ کوئی چیز ہے جو انسان کو کجھوتے پر مجبور کرتی ہے۔“

”کون سی چیز؟“

”کونسی طاقت؟“

”کونا خوف؟“

”جس روز صبح کے تین بجے ہاری بیرک کی تباشی ہوتی اور بعد انکیم کے ہاتھوں میں بگان کا

دیا ہوار و مال نکلا۔ اس سے کوئی پندرہ دن پہلے سے ہماری بیرک میں آہستہ آہستہ کسی کی ملے امید کا فوز امداد بچکر رونے مگر اسی طرح کسی ہلاکو خان کے دبار میں پہلی بار کسی درویش کی امداد ہو۔ جو شی ہماری نظریں ایکدی صورت سے لکھاتیں گویا چتفاق درگشتے اور شخصی شخصی چنگا ریاں پڑھنے لگتیں۔

بیرک میں ہم اکٹھا آئی تھے، ہم سب کی دارالصیاح بڑھی ہوئی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے رونے گو اپنے دنگ کی گدھ سے بھرے رہتے اور ہمارے ہونٹوں پر کامیابی خشکی نظر آتی۔ ہمارے چہرے بھر کے کتوں کی طرح جیں خیں کرتے نظر آتے۔ پوٹھوہار کامیاب خان بھی ہم سے مختلف نہ تھا۔ گودہ صبح سوریہ سے قرآن خوانی کرتا۔ اور اپنی نمازیں باقاعدگی سے پڑھتا۔ لیکن بعد انہیم ہم سبے مختلف تھا۔ کئی میسینے وہ نہیا نہیں تھا لیکن اس کا بھروسہ اس کے ہاتھ اس کی آنکھیں اچھی تھیں۔ میاب خان اتنے منہ اندھیرے سے قرآن کی تلاوت شروع کر دیتا کہ ابھی حروف دیکھنے کیلئے روشنی نہ ہوتی لیکن شاید وہ اپنے ذہن سے کھڑ پکھڑ کر یادداشت کے بھروسے پر آیات پڑھا کرتا تھا۔

ہم سب شجون مارنے والے جاؤروں کی طرح اپنے اپنے پنگ پر نیٹے فرار ہو جانے کا خواب، لیکھنے تے ذریتے ہوتے اس کی آواز سنتے رہتے۔ ہر لمحہ کچھ ہو جانے کی آزادی ہتی۔ کوئی اکثر شد، کوئی گرامت، کوئی مجرمہ پیش آجلنے کی خواہش بدن پر گیوں کے سے کی طرح پڑی تھی۔ رنگتی رہتی۔ کبھی لگتا یہ خواہش دل سے اٹھا ہے کبھی لگتا کان کی لوکے قریب کمیں سے صدا آئی ہے۔ کبھی پنڈلیوں میں اس آرزو کی دستک ستائی دیتی۔

اور میاب خان آہستہ آہستہ کہتا رہتا:

اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارہی دیں اور ان سے مردے بھی باتیں کریں اور زندہ کھڑا کر دیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانیوالے نہیں بجز آنکہ خدا چاہے۔ پھر آہستہ آہستہ دل باغی ہونے لگتا۔ ایسا دل جو ایک قیدی جسم میں رہ کر ہی باغی ہو سکتا ہے۔

دل اپنی بچی میں ہمیں پیسے نگتا اور پوچھتا: " بتاؤ۔ تمہارا خدا کب تک نہ چلے گا؟  
کب تک — کب تک — ؟

جب جسم قیدی ہو تو دل کو سمجھانا آسان نہیں رہتا۔

ایسے لمحوں میں جب دشمن کے بوٹوں کی آواز آرہی ہوتی، خدا سے سمجھوتہ کرنے کو جیسے  
چاہتا۔ وہ اتنی دور تھا۔ اور انسان کفر کی باتوں سے وباude تسلی حاصل نہ سکتا تھا۔

وہ مشرق اور مغرب کا ماک تھا۔ اس کی تو ساری دنیا تھی۔ پھر ہم ایک پھوٹی سی بیرک میں  
رہنے والوں کے ساتھ اس کا کوئی خاص رشتہ کیونکہ ہو سکتا تھا۔ اسے ہمارا دل رکھنے، ہمارا دل جیتنے  
کی اتنی کیا ضرورت تھی۔ ہم اس کے رحم کے بغیر بے دست دپا تھے لیکن اسے تو کوئی ایسی مشکل نہ  
تھی۔ وہ تو کسی کا محجراج نہ تھا۔ میرانہ پوٹھو باری میاں خان کا نام عبد الکریم کا۔

آہستہ آہستہ صبح کا تارا ڈوبنے نگتا۔ میاں خان کی اواز بے زگ ہوتی جاتی۔ .... وہی  
خدا جو رات کی تہائی میں اندر ہے کی طرح قریب رہتا۔ آہستہ آہستہ دوڑ رہتا جاتا۔ لا نقعت —

بے پروا — خاتا کہ رہا رہا رہا رہا رہا۔ ہماری رسانی نہ تھی۔ ہماری رسانی تو ان افسروں تک نہ ہو سکی جنہوں نے  
ہم سے سچیادہ ڈالا دیئے۔ ہماری رسانی تو ان لیڈروں تک نہ ہو سکی جنہوں نے ہماری قسمت کا  
فیصلہ کیا۔ ہم تو ان عکلوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے جن کے ہاتھوں میں کمھتیں یوں کی ریاں تھیں۔  
پھر خدا تک کوئی کیسے پہنچا۔ کیا خدا کو بھی اس سازش کا علم نہیں تھا۔

جس رات صحیح تین بجے تلاشی ہوئی اسی رات کو لپیان فریبہ اور اس کے تین سپاہی فزار ہوتے۔  
اس واقعہ سے پورے پندرہ دن پہلے ہماری بیرک میں عجیب گم خوشی تھی۔ ہمارے دامغول پر  
بخار کی کیفیت تھی۔ دوپہر کے وقت اور ہر کی الی ہوتی ہوئی دال کے ساتھ روٹیاں آئیں تو دیر تک  
آسیب زدہ شکلوں سے کبھی ہم کھانے کو دیکھتے اور کبھی ایکدوسرے کا چھوٹکتے۔ اس روز ہم  
جنون کی آخری مرحدوں پر زندہ تھے۔ کبھی کبھی ہمیں نگتا۔ ہم سب اتنے لمبے اور وجہیہ ہیں کہ  
یقینیت ہر ہنس اور اس کے سپاہی ہیں سب باشیئے نظر آنے لگتے۔ کبھی ہم سب اتنے بُنے

نظر آتے کہ ہر بنس اور اس کے سپاہی چھت تک اوپنے دکھائی پڑتے اور اپنا وجد بوف جیسا نظر آتا۔

دماغ پر بخار کی سی کیفیت تھی EUPHORIA کی کیفیت! ایسا بخار جس میں بھی بھی دل و دماغ میں ہو جاتے اور پھر بھی کان کی لوئی جلنے لگتیں اور پوٹے بھادی ہو جاتے۔ جتنے دن کپشن فرید اور تین سپاہی فراز نیں ہو گئے ہم سات اگلی ۰۴ م دوٹ کی ننگی تاریخ تھیں۔ لیکن عبد الکریم ہم سے مختلف تھا۔

وہ اہم کی دال اور باسی روٹی کھا رہا تھا تو سیٹی بخارنا تھا۔ جب سے وہ قیدی ہوا تھا سے سیٹی بخاری آگئی تھی۔ اس کی سیٹی کی اواز سن کر ہمیشہ لگتا گویا دہ آزاد ہے اور کسی بھرے پر سوارندی پر بتا جا رہے ہے۔

ساری ہے دس بجے کے قریب اسی رات جبے ۔۔۔ تلاشی ہوئی اور کپشن فرید فرار ہوا اسی رات ساری ہے دس بجے گارڈ کا سپاہی ہماری بیرک میں آیا:

"یہ سیٹی وون بخارا ہے؟"

"میں جی۔ عبد الکریم!"

"نبر؟"

"غمبر با سٹھ مر!"

"کیوں سیٹی بکار ہے ہو؟"

"لبس جی۔ ایسے ہی۔"

سپاہی نے دانت نکال کر دوھے کہا: "تمہیں تمنی بار کھلہ ہے ایسے ہی کچھ مت کیا کرو۔

..... سمجھے؟"

"اچھا جی۔"

عبد الکریم خاموش ہو گیا۔

نحوڑی دیر خاموشی رہی۔ گارڈ کا سپاہی دروانے سے ٹک جا کر ڈک گیا۔

نمبر باسٹھ:

"جی صاحب:

"ت ملکیشکر کا نام سنا ہے تم نے — ؟"

"جی سر:

"یہ گانا سنا ہے — آئے گا آئے والا —"

"جی صاحب:

"ذرا سی بخاؤ اس دھن پر — لیکن جب میں کوئی فوراً بند کر دینا۔"

"لیں سرت:

عبدالکریم وثمن کے سپاہی کو خوش کرنے میں کافی دیر تک سیٹی بجانارہا۔

آئے گا آئے والا —

آئے گا آئے گا آئے گا —

بیتروں پر تختوں پی طرح لیٹے ہوئے حملہ کر نیوالے چوکس چونکیں جانوروں کی طرح پنجے سکوئے  
ہم سب اپنی سانسوں کا بوجھ تختوں پر محسوس کرتے ہے۔ ہمیں وہ لوگ یاد آئنے لگے جو پاکستان  
میں ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ اسی لمحے ہم قیدی نہ رہے۔ ہمارا اپنا کوئی غم نہ رہا۔ خود نرسی کی  
کیفیت مٹ گئی۔ غم کا دھارا اگر یا اشیب کی جگہ فراز کی جانب چلنے لگا۔ اس یستے نے ہمارا انعام  
ذلتیں، رسائیاں، جھوک، تنگستی، ظلم، بے غیرتی، بے عزتی کو لپٹے میں سکولیا۔ اور اس پرانا لوگ  
کا غم غائب آگیا جو ہمارے لئے ترس رہے تھے۔ جو ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ ہمارے  
لئے غیر مسلسل تھے۔ گویہ غم معلوم تھا لیکن ہمارے غم سے بھی زیادہ جان لیوا تھا۔

واپس کا راستہ اب بہت سربرز ہے۔ دونوں جانب گھنے گھنے لیکر کے بڑے بڑے بھارڑ  
ہیں۔ چادوں کے کھیت اور کھیتوں میں اگلی ہوتی ٹاہیاں ہیں۔ جس وقت میں اس تحریک پر گئے گورا

تو معاً مجھے خیال آیا کہ میں اپنی بے داش و صرفی کھلئے کوئی سخفات لے کر آیا ہوں؟ —  
میری قسین پر تودھبی مارک تھے۔ برس کے دانے تھے۔ میں کیسا صاف تھا جو اپنے ڈلن کے لئے  
داند اور قسین کے علاوہ اور کچھ دلا سکا؟

پی فارسیں

ڈبلیو فاردار

دو نون ایک ہی صلیب کے حصہ تھے۔

وہ سارے پھول جو سرخ قالین پر چلتے وقت مجھ پر گرے.....، کیسے پھول تھے کہ جب  
گرتے ہی رہے اور میں ہی قبر کی اندان کو پھونے سے قاہر رہا۔ رنگیں جھنڈیاں دودویہ اکتوبر  
کی دھوپ میں چک رہی تھیں۔ میں نے اپنی وردی کو دیکھا — اپنے ہم وطنوں کے باس کو  
دیکھا اور میرا سر زندگی سے بچ گیا۔ مرد کو نام درکنے والا اس کا حکم نہیں ہوتا اس کی روح  
ہوتی ہے۔ جب مرد پاؤں قیصلے چھوڑ کر اپنی کشی کی پزار کسی اور کو پہنچا دیتا ہے جب وہ اپنے  
فیصلے، اپنی محبتیں، اپنی نفرتیں سمجھوتے کے عومنی نیک ڈالتا ہے۔ جب ہر طرف سے ALL  
کا کاشی سن کر اس کے کان جنگل کے گیدڑ کی طرح کھڑے نہیں ہوتے تو مرد کے  
ہوشیں ایک کمیکل رد عمل ہوتی ہے۔ سمجھوتے کا CATALYST اس لمحک خاصیت بدلتا ہے۔

جب بنا گئے رہنے کے باوجود وہ سویا ہوا ہو۔

جب چلتے پھرتے ہوئے وہ لس سے سک نہ ہو۔

جب وہ مرد چکا ہے لیکن ذمہ رہتے۔

تو وقت مردی آخری صافی بن کر اس کا ساتھ گھوڑ دیتی ہے۔

ہیں خٹکی کرنے میں ہندوستان کو پچھا تی زیادہ ویرنہیں لگی کیونکہ سختیاڑا نے سے  
کچھ دیہ بعد ہم سب مر جائے جسیے پھل ڈٹنے کے بعد بہت دیر تک شستگفتہ رہتے ہیں اور کسی کو

احساس نہیں پہنچا کر وہ مر چکے ہیں۔ ہم بھی تروتازہ رہے۔ کھاتے پیتے ہے اور نہ نہ رہے۔ جس رات پورے تین بجے دوبارہ تلاشی ہوئی اس سے کچھ دن پہلے کی بات ہے بندوستاں کے تمام جگنی کیپوں میں شام اتر ہی تھی۔ یہ شام کامزاج ہے کہ پہنچنے ساتھ دھنڈ کے، ٹھراڑا، خاموشی اور گھر کو واپسی کا تصور لے کر آتی ہے۔ میں سلاخوں والی کھڑکی سے گھر لوٹنے پر نہ دن ہوں کو دیکھو، با تھا پہنچنے چڑیاں غول گئیں کیونکہ چڑیاں انہیں میں گھر لوٹنے سے دلتی ہیں۔ پیر کو تو ہواں جہاڑوں جیسی فوریتیں دین سیرے کیلئے لوٹے۔ پھر کالی کیپوں کی ایک ڈار گئی اور آخر میں وجوں کی مانند سفید صفائی نگ کے پرندے گئے مذہ جانے ان سب کا کوشاں اس کے بعد شفقت کا منظر بخوبی یا۔ کھاتی کی جانب سے غول در غول بادل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں میں پانی کی بوندیں کسی کنواری کے آنسوؤں کی طرح ہوئے نگیں۔

کیپٹن فرید اس وقت چونکل جانور کی مانند جاڑوں ٹراف نظریں دوڑا رہا تھا۔ اسکے فیصلے کی گھر یاں کاشی سے آئیوالے بادلوں کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

عبدالکریم نے مری پھری اواز میں کہا: ”یہ خبر ہے اخبار کی:

”تم چپ کرو عبدالکریم:

”لیں سر:

عبدالکریم خاموش ہو گیا لیکن میں کی بچت بارش کی بوندوں سے ٹپاٹپا بول رہی تھی۔ غالباً ہماری الکھنی بیر ک ایسی تھی جس میں آفیسر اور یونک کے آدمی اکٹھے تھے۔ ورنہ بندوستاں نے سپاہیوں اور آفیسروں کو علیحدہ علیحدہ کر کے دونوں کی جنوباتی زندگی کو م Jord ج کر رکھا تھا۔ یہ بھی اس نے ہوا کہ آفیسر کے بچ کی بچت ایک رات اپنا نک گر پڑی اور انہیں ہمیں ادھر ادھر بانٹا پڑا۔ آج کوئی تاریخ ہے: میاں خال نے بڑی دیر بعد سوال کیا۔

تاریخ پوچھنے سے کو نافری پڑتا ہے۔ ان بیرکوں میں رہنے والوں کو صرف ایک تاریخ  
یاد ہے۔ سترہ دسمبر ۱۹۴۷ء

سب خاموش ہو گئے۔

لیکن بعد اکرمیہ سیٹی بھانے لگا۔ بلکی بلکی زندگانی میں کوئی جیسی ہستی سیٹی۔  
ہم سب سترہ تاریخ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ کمل آنکھوں میں اپنے سمجھوتے کا دن منگا تھا  
شعب ابی طالب سے اٹھنے والی چینیں ہم سب کے اندر مجنہوں گئی تھیں۔ ہم سب قطار درقطار  
ناٹک کے حضور کھڑے تھے۔ ہمارے افسروں کے کندھوں پر سے ان کے ملٹری میٹار، بر سوں کی منت  
کے بعد حاصل کئے گئے اعزاز بیداری سے کچھ کھاپ کر پھینکے جادہ ہے تھے۔ فوجی لوگ ساری  
ساری زندگی انہی تاروں، انہی اعزازوں کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے کرنل  
ہمارے بجزل تیم بچوں کی اگرزو دل میں لئے لب پسپنے کھڑے تھے۔

ہم سب کے ہوش مفید تھے۔ دل ساکن تھے سب کی نیضیں خاموش تھیں۔ ہم سب  
سمجھوتے کا دن منار ہے تھے۔ اندر ہی اندر رہے تھے: امرد ہو رہے تھے  
ذلت کی لہریں قطار تھار کھڑے سپاہیوں کو روند رہی تھیں۔ ہمارے لیو کا غیر بد رہا  
تھا۔ اس کے روکن مختلف تھے۔ اس کا رنگ اس کا صہرا بدل چکا تھا۔ یہ متعفن نالی کی طرح رک رک  
کر چل رہا تھا اور ہم سب کھڑے تھے۔ گویا یہ بُر کن ہشید ڈول ہو۔ ابھی ابھی جہاز کے ہر شے  
پھسل کر ہمیں ہمیشہ کے لئے سمندر کی نہ میں ڈوب کر بہادری اور جان بازی کی ایک بہت بڑی  
روایت چکر جانا ہو۔

انسان مرنسے پہلے، ذلت سے پہلے، بربادی اور تباہی سے ہم کنار ہوتے ہوئے  
ہمیشہ بھروسی کی ارزوں میں مرتا رہا ہے۔ ہمیں بھی لیتیں نہیں تھا کہ ابھی چند گھنٹے بعد ہم اجنبی  
سپاہیوں کے ساتھ بیرونیا رد کے، بندیسوں میں مختلف کمپیوں میں نیچع دیئے جائیں گے  
اور پھر خاردار تاروں کے پیچے ہمیں قدم پرست نئے دھوپی مارکوں سے داغا جائے گا۔

پی فارسیں  
ڈبلیو فاروار

ہمیشہ ساتھ ساتھ۔ سیاہی توام بچوں کی طرح۔

اس وقت جب کیپشن فریڈ لپنے دل میں کلاشی کے بادلوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور عبدالکریم کی سیئی آخڑی پنجم کو پھرہی تھی۔ لیفٹینٹ ہر بنی وائلہ بھوار۔

”تم سب کی روپورٹ کی ہے حوالدار بجا یہ نہیں۔“

”هم سب خاموش رہے کیونکہ قیدی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔“

”تم سب کی روپورٹ کی ہے حوالدار بجا یہ نہیں۔“

کیپشن فریڈ جو دیوار کے ساتھ رکا بادلوں کو شام کی آخری روشنی میں دیکھ رہا تھا، انہیں

میں بولا:

”لکیسی روپورٹ۔“

”تم سب آدمی اور ہی رات بہت باتیں کرتے ہو۔ سازشیں کرتے ہو۔ منصوبے بناتے ہو۔“  
ایک سینکڑ کے اٹھاڑوں حصے میں کیپشن فریڈ نے ان تین ساپا یوں سے آنکھیں ملنیں جو  
اس کی کمپنی کے آدمی نہیں تھے لیکن اس کے ساتھ مذفرہ ہونیوالے تھے۔

سیال خان نے گلا صاف کیا اور پڑھوڑا لمحہ میں بولا:

”سر، ہماری کیا باتیں ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان عورتوں اور بچوں کی باتیں کر لیں گے جو ہم سے میلوں دُور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس ملک کی باتیں کر لیں گے جو اب ہمارا ملک نہیں۔۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس خدا کی باتیں کر لیں گے جس کا نصیحت ہم کو سمجھ نہیں آتا۔۔۔۔۔ فی الفور۔“

ہر بنی نے اپنی بندوق کا بینٹ کیپشن فریڈ کی کارروں پر ارتے ہوئے کہا:

ہم نے اپنی ٹرینگ کے زور پر جلدی سے لائٹ بنائی۔  
سکھ سپاہی نے کاش دیا۔

مارچ — نفت رائٹ ..... نفت رائٹ .....

ہم تک سے باہر نکل آئے۔

بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے سیوف کے پاس مخفیہ تھیں راٹلوں کے دلانے چک رہے تھے  
شامگھری ہو چکی تھی اور کمپ کی بتیاں بارش میں اور بھی چک رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر جیسیں بارش  
میں بھیک رہی تھیں۔ ہم سے کافی دور و جدید مارک لگے کچھ اور سپاہی اداچ کرتے ہوئے جا رہے  
تھے!

یقینیست ہر بنس ہمارے سامنے تھا اور درودیہ ہمارے ساتھ ساتھ جو سپاہی مارچ کر رہے  
تھے ان کے ہاتھ بلبی پر تھے اور بندوقوں کے منہ ہماری جانب تھے۔ اُلیٰ کے درختوں کے پاس پہنچکر  
ہمیں رکنے کا کامش نہ ملا۔ پھر ہمیں سیدھی لائن بنانے کا حکم دیا گیا۔

میان خالا اب اونچی آواز میں سورہ الیمن پڑھ رہا تھا۔

”تم ہمارے خلاف کیا بڑا بڑا ہے بونبر ۲۷ نہ ل۔“

”جذاب میں سورۃ پڑھو رہا ہوں۔“

”ہماری حورت کو قم کافی نہیں پڑھو چکے ہو مذاکر میں کھو توں ہو رہیں بھی جلوہ دکھادیں۔“

یقینیست ہر بنس اور اس کے سپاہی بنتے کھل کرہنے۔

”مُسْلُو، تم سب ہند مرکار کے خلاف آؤ ہی آؤ ہی رات کو بیٹھ کر باتیں کرتے ہو جا۔“ DAMN IT

ہمارا لامگوں روپیہ تم پر خرچ ہو رہا تھا اور تم ہمارے روپیہ کیڑے ڈالتے ہو جوالدار بھائی نے یہ

سب کچھ لکھ بیٹھا ہے ہیڈ کوارٹر کو تم کہتے ہو پاکستان سے آئنا لے پاڑلوں کو ہم چڑھایتے ہیں.....

”تم وشاں ہند مرکار کے خلاف ایسی باتیں کرنے کی جگات کیسے کر سکتے ہو؟“ BASTARDS

”ہر بنس کو لو تاچلا گیا۔“

وہ بڑے ٹائم رخسار دل والا نو جوان تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ہندو اسرتی کی چھاپ نہیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ امرد پرستی کا فونگری سے شکار رہا ہوا اور سمجھتہ مفعول کا کروانا کرتا رہا ہے۔ اسکے نازک بیٹے ہاتھوں میں نرت کی سی کیفیت تھی۔ ہو سکتے ہے کہ وہ پچھیں میں اتنی بار کرشن کھنیا کا پاچھا لے گا ہو کہ اب اس کی چال ڈھال آنا جا مل سب ایک مرلی بجانے والے سے مشابہ تھے۔ جگ، سختی، درشتی، بد کلامی، سب اس کی ٹریننگ کا نتیجہ تھی۔ ان چیزوں کا ہر ٹھنڈک روشنے کے قی تعلق نہ تھا۔

وہ اعلیٰ کے درخت ملے کھڑا تھا۔ بارش سیدھی اس پر نہیں پڑ رہی تھی لیکن پتوں سے سپل کر جو بوندی اس کے چہرے پر گرتیں وہ اس کی موچھوں میں پیش جاتیں۔ اتنے ٹائم رخسار دل پر اتنی گھنی موچھیں عیوب سی لگ رہی تھیں۔

وہ بوتا چھا جا رہا تھا۔ ناخ کی سرگزی کے ساتھ۔

”تمہیں پھر ایسی باتیں کرنے کی جگات نہیں ہو گی۔ تم لوگ وہ ختنہ شدہ کئے ہو جانپی کسی غلطی سے کوئی نہیں سکتے۔ اگر سیکھ سکتے تو غفل DYNASTY کا یہ DOWNFALL ہوتا تھا نے انگریزوں کو بندوستان میں گئے ہیں۔ پہلی نسلی! تم نے پاکستان بنایا۔ دوسرا نسلی! تم نے مشرقی پاکستان کو آزادی نہ دی۔ تیسرا غلطی! — لیکن نہیں۔ تم کو اُر سہار سکسا یا جائے تو بھی تم کچھ نہیں سمجھو گے۔ ختنہ شدہ کام کبھی کچھ نہیں سیکھتا۔“

بکھر دہ چپ ہو گیا۔

صرت بارش کی آواز آتی رہی۔ بہت دُور بیر کول کی طرف ایک فارُکی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے گرفتی مود کر دیکھنا پا ہاں لیکن موت کے ذرے ایسا زکر سکتے۔ اس فارُک کے ساتھ بھی وُد کرنے کے ہو نکنے کی آواز آئے۔ اکٹھے دس بیس کے پھوٹی بڑی کرخت آواز میں بھر نکلنے لگے۔ بارش اور بھی تیز ہو گئی۔

ہمارے سر دل پر جو توں میں ہمارے دعویٰ مارکس پر مدد دیں کی نیجے بارش پڑنے لگی۔

پھر کتوں کی اواز نزدیک ہو گئی۔

اور نزدیک — اور بھی نزدیک — بالکل نزدیک۔

پھر ان کتوں کو لانے والے سپاہیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹھنڈی ہوا مل کی ٹھنیاں ہجھلانے لگیں اور پانی کی بندیوں ہر بنس کے چہرے پر بڑے تواز سے گرنے لگیں۔ سارے گاؤں میں خوف کی سیشیں بخ رہی تھیں۔ جانے وہ بیک ٹریٹر تھے کہ اسیشیں۔ جانے وہ دس تھے کہ بیس جانے وہ رسیوں سنتھیوں سے بندھے تھے کہ نہیں۔ بین گمراہ شام میں چکتے ہوئے لکھے جبڑے تھے۔ بیگی بیگی جھری پوستین تیز ناخون رالے پنچے اور بیگڑیوں جیسی پھیر پھاڑ دینے والی خوف ناک آوازیں تھیں۔

سپاہی کو اپنے بھتیا روں پر ایسا ہی بھروسہ ہوتا ہے جیسا وہ اپنے مردی اپنی مردی اور اپنے افسر پر کرتا ہے۔ ان سب چیزوں کو لا کر سپاہی کا حوصلہ اس کی بہادری، اس کی جوانمردی، بُنگتی ہے۔ ہوقت ہم ایک ایسی طوائف کی طرح محسوس کر رہے تھے جو اپنے سازندوں، میک اپنے سامان اور خوبصورت بیاس سے بچھڑا گئی ہو۔

ہم خللی ہاتھ خالی ذہن تھے۔

ہم نہ بہادر تھے نہ بروں۔

ہم بس کھڑے تھے۔ کچھ اپنے اندر خوف سے کٹھے ہوئے اور کچھ اپنے وجود سے باہر اپنے وجود پر چکن کھائے ہوئے۔

ناہر دی کا بھی ایک سلسہ ہوتا ہے۔ بے استہادی، کم حصہ اور خوف کا بار بار سلسہ گز شستہ سے پورتا۔ ہمارے فیصلے ہمارے تھے۔ مردود ہوتا ہے جو اپنے فیصلے سے زندہ رہتا ہے۔ اپنے فیصلے سے رہ جاتا ہے۔ ہم نہ زندہ رہنے پر قادر تھے۔ مر جانے کے قابل۔ ہم نگ میں کی طرح کمیں راہ میں کھڑے تھے۔ بے عصلہ، مٹے ہوئے لتوش تھے۔

ہم بربنس کے سامنے کھڑے تھے جو اس وقت بارش میں جیک لین کی طرح نظر آ رہا تھا۔

پھر کسی نے کاشی دیا اور کہتے یکبارہم پرچھتے۔  
بارک دور تھی اور — آسمان دُور تھا۔

بارش پھر تو اتر سے برسنے لگی تھی۔ بیریک کی بتیاں روشن تھیں اور کاشی کی جانب سے ہوائیں  
گز نگی تھیں۔ ہر ٹینس اور اس کے سپاہی ہنس رہے تھے۔

کہتے ہماری وردیاں فوج رہے تھے۔ ہم کیچھڑیں گر رہے تھے۔ جھاگ رہے تھے۔ گتوں سے  
روپ رہے تھے۔ کہتے جھاگ رہے تھے۔ ہلاک رہے تھے کیونکہ یہ انھی گاؤں میں ٹرین کے دو گے<sup>گ</sup>  
تھے۔ یہ ان کا گھر تھا۔ یہ کہتے چاہتے تو ہمیں ختم کر سکتے تھے لیکن وہ ہمیں ختم نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ  
ختم کرنا ان کی ٹرینیگ میں شامل نہیں تھا۔

ہم جھاگ رہے تھے۔ رُٹھک رہے تھے۔ پسپا ہو رہے تھے۔ ہمارا ایسا کوئی ٹھر نہیں تھا جو  
سمت ہم جاسکتے۔ میدان سے آگے خاردار تاری تھیں۔ ان سے آگے خند تھیں۔ بند تھیں۔  
مشین گئیں تھیں۔

کھونٹی پر میری وہ وردی لٹک رہی ہے جسن پر صلیب کے سے دبیسے پڑے ہیں۔ صلیب کی  
ایک جانب امن کا پہلا حرف پی کھا ہوا ہے اور صلیب کی درسری جانب جنگ کا اولین لفظ ڈیبو  
ہے۔

میں سوچتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں۔

کیا ہر امن کیلئے جنگ مزدود ہے؟

کیا امن صرف اندگی کا وقفہ ہے؟ یعنی جنگ سے جنگ تک — عافیت کا درمیانی  
وقنہ۔ جس طرح ہم پرچھتے کہتے تھوڑی دیر تک دُسرا دھارے ہمارے سینوں پر رہتے تھے۔ ہیں  
اڑاؤ ہونے کی ہمت دیتے تھے۔ کیا امن کی بھی اتنی ہی مدت تھی صرف اپنا پنڈا چھوڑنے کی  
مدد!

یہ یو این کیا تھی؟

سیکورٹی کوںل کے کیا پچکر تھے؟  
دیو کا نشہ — دیو کا اندازہ۔

یونیکو، ہتو، فاؤ، سیٹر، سنٹر — یہ سب انگری کے وقتنے تھے۔  
تھکی ہوئی قوزی کوستارنے کیلئے بڑی بڑی شاندار بلندگیں — بڑی بڑی امن گائیں  
عافیت کے لئے، — پشاچہڑا کی معلمیں۔

ابھی تھوڑی دیر پسے میری بڑی بیٹی عائشہ میرے پاس تھی۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ طلاق ہو جانے کے بعد جو وہ اپنے شوہر کے پاس نامپور جی گئی ہے اور  
شوہر کے سرو نہیں کوارٹر میں رہتی ہے۔

کسی نے مجھے عائشہ کے متعلق کچھ نہیں بکھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی کمی باہمی اور پری اور راجبی  
لگتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی اس طرح باتیں کرنے لگتے ہیں کہ میں اصلی متن کو سمجھ نہیں پاتا۔ مجھے سایاق دباق  
مجھے میں بڑی لمحجن ہوتی ہے اور میں اصل نفسِ مفخون کی ترکوں نہیں پہنچ سکتا۔ پھر مجھے یوں لگتا ہے کہ  
جیسے میں کسی شبہ، بازکی رسی پر چڑھا ہوا میں متعلق ہو گیا ہوں۔ میری کتاب زندگی کے کئی صفحے بیچ  
میں سے غائب ہو گئے ہیں۔ گویا بربناۓ کثافت حذف کر دیئے گئے ہوں۔ اپنے گھر والوں میں بیٹھے  
بیٹھے مجھے لگتا ہے کویا ابھی بخچھ گھر جانا ہے۔ میں کسی ایسے عجوب کے رو برو شکست دل بیٹھا ہوں  
جو میرے قریب کے ساتھ آنکھوں میں بھی پھری واسانیں کہہ سن رہا ہے۔ ان دونوں کی پتوں  
میں کئی رمز ہیں۔ وہ دونوں ٹیکی ڈون کے پونگے اٹھائے آپس میں مخلوقی باہمیں کر رہے ہیں اور میں  
ٹیکی ڈون کے کھجھے سے کافی لگائے ان پریمات کو DECIPHER کر رہا ہوں۔

عائشہ ابھی نامپور جانے سے پہلے میرے پاس آئی تھی۔

عائشہ کی علی چھبیس سال ہے لیکن اس کا سارا وجود معاشرے اور مرد کی شان در شکست کی بھی میں  
جل چکا ہے۔ اگر عائشہ کا خدا چاہتا تو ابھی وہ کچھ سال اور جوان رہ سکتی تھی یعنی کہ خود بخود کہیں میرے  
اندر جنم لیتے رہتے ہیں۔

جانتی ہو عائشہ۔ ہر فلمہ نہیں ولے کا بھی اتنا بھی تصور بنتا ہے جتنا کرنے والے کا —

نغم کو برداشت کر کے تم قائم کی پورش کرتے ہو:  
 "شیک ہے اباجی۔ وہ اپنے بھروسی پکے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی  
 میں نے تمہیں منج کر دیا تا لامپور جانے سے:  
 "جی اباجی۔"

"مجید تمہیں طلاق دے چکا ہے — وہ تمہاری صورت سے نفرت کرتا ہے۔ تم میں اتنی  
 غیرت نہیں۔ تمہاری عزت نفسی اس قدر رنجی ہے کہ تم اس کے مردشیں کوارٹر میں رہنا پسند کر قی  
 ہو گو۔"

اس کا چھرو فت ہو گی۔ مجھے پسے کرے سے وہی کتوں کی اوازیں آنے لگیں۔  
 "عاشر۔ کیا تم نے مجید کو معاف کر دیا ہے؟"

"جی اباجی — معافی کا فعلت دل سے ہے۔ اباجی اور میرا دل اتنا اچھا  
 نہیں۔ نہ ہی دل کسی کی ماننا پڑے۔"

"عاشر۔ تمہیں معلوم ہے مجید تمہیں طلاق دے چکا ہے۔"

"بھی قسم لے لیں۔ میں کبھی ان کے سامنے نہیں کئی۔"

"یہ بھجو تو۔" پہ ناپاک بھجو تو بونے کیا ہے اس کی شرطیت کیا ہیں۔"

عاشر نے چند نانیے اخراجیت سے ہوت بند کر کر پھر جب اس نے منہ کھولا تو اس  
 کے ہونٹوں پر سنیدھنیہ لکھیریں ڈال گئی تھیں۔

"جی — ایک شرط تو یہ ہے کہ میں کبھی کوئی میں قدم نہیں رکھن گی۔ اور دوسرا یہ ہے۔

"کم... کم... کہ میں مجید صاحب سے کبھی نہیں ٹلوں گی — نہ علیحدگی میں نہ کسی کے ملنے۔"

"تم نے یہ اندھا گوناگونا بھجو تو کیوں کیا — کیوں کیوں کیوں؟"

میں کیا کرتی اباجی — وہ منی کو ایک دن سوولت فیصل آباد لئے کئے تھے۔ میں کیا کرتی

تابائیے اباجی۔ نیرے پاس منی کے سولئے اور بت کیا — تبلیغی؟"

میں چپ بوگیا۔ مین والی بیر کوں پر بارش کی بوندی گرنے گیں۔  
عاشرہ ما تھجورڈ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ رانہ درگاہ قامترنسوانیت سے عاری بروچی تھی۔ نسوانیت میں شوکر لگانے، من سے  
چلنے اور ملائیٹ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ برسوں کے تپوی باتی ہے۔ بادشاہیاں اٹا  
دیتی ہے۔ تکنی کا ناچ پرانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ عاشرہ محل طور پر پیاسا شدہ عورت تھی جس کے  
جسم کا ایک ایک بند ایک ایک ڈبی، ایک ایک شریان، ایک تجوہتے کیلئے سائنس لے رہی تھی۔  
اس میں نسوانیت کا شوشه داحد بھی باقی نہ بچا تھا۔

عاشرہ کے پاس اپنے گھر میں داخل ہونے کا کوئی دینا کوئی پاسپورٹ نہیں تھا۔  
اس کے گھر کے چاروں طرف ڈھاکر کی ہری گھاس لگی ہے لیکن یہ سب اس کیجئے مخوذ تھے  
ہے۔ ایک تجوہتے کی خاطر وہ سب کچھ پورٹجی ہے جیسی کہ اپنی نسوانیت بھی۔

جس رات کیپشن فرید نین سپا یکوں کے ساتھ فرار ہوا اس رات بڑی شندت تھی۔ ہالہ کی جانب  
سے اچاہک خندی ریڑھ توڑھتا ہوا ذرا کاریا آگی تھا۔ مین کی چھت سے نکلتی ہوئی یہ ہوا ایسی  
خوفناک جتنا تی سیٹیاں بھاڑتی تھیں۔ سیلہ مر جیسی خندی اندر بیری رات تھی۔

وہ رات کا آخری میں جاری تھا۔ ہمسب پافی کی ایک ہوٹی بوندی کی طرح حرف حلتی میں زندہ  
تھے۔ کیپشن فرید درستے اوپنے اوپنے کردا تھا، اور فرش پر لوٹیاں رکارہاتا تھا۔ بڑی دینہ ک  
کیپشن روتا چلتا اور خدا کے واسطے دیتا رہا لیکن ہم سب جانتے تھے کہ جلدی شہزادی نہ ہوگی۔  
کیپشن کی آواز اس دو نے دھمنے کی وجہ سے بالکل بیٹھ چکی تھی۔

بھیرا چانک قفل میں چابی پڑی۔

کیپشن فرید کے سپاہی سماں میں سکر ALERT ہو گئے۔

”کیا بات ہے؟“

”خیجھے اسی وقت کسی ڈاکٹر کو دکلیتیئے ورنہ میں ہرجاؤں گا۔“

کپتان فرش پر اس شدت سے نکلے مارنے لگا کہ فرش پر جا بجا لو کے داغ پڑ گئے۔  
اس وقت ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں؛ گورکھا سپاہی بولدا۔

خدا چکیتے — آپکو راجا زماں کا واسطہ :  
وہم کچھ ہیں کوئے۔ صبح دیکھی جائے گی۔  
گارڈ والیں مڑا۔

تینوں نیولے نا سپاہی گارڈ کے درون کے منتفع تھے۔

کیپشن اب اپنے سینے پر ملکے مارہ لاتا اور زور زور سے بوٹ فرش پر دھاڑ رہے تھے۔

گارڈ کے مردنے کا فیصلہ کن لمحہ تھا۔

کچھ باتیں یافیستہ اگر ٹھنڈے دل سے کئے جائیں تو مخفی ان کی خوف ناکی کے پیش نظر آدمی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے لیکن انسان کی سایہ بھی میں کچھ لمبے ایسے سر پھر سے بے پروا اور لا ابالی ہوتے ہیں کہ جب اُدھی ہوا میں اڑنے کی سوچتا ہے اور اڑنا ہے۔ مشتری کو پیچھے چھوڑ جانے کا فیصلہ کرتا ہے اور ایسا ممکن ہو جاتا ہے۔ ان طور میں ساولوں کی قوت بند ہوتی ہے۔ اپنے آباد و اجداد کی جمیں صد جیتیں بخوبی ہیں۔ یہ قوت اور فیصلہ کا لمحہ اپنے اندر را بیدت کے جلاشیم رکھتا ہے۔

اسی ایک لمحے میں تینوں سپاہیوں نے لستر کی چادر گارڈ پرڈاں پھر منے سے پہلے گارڈ کے حلقے سے ایک چکیا سی نکلی اور بندوق کی لبی بی پر اس کا ماتحت ڈھینلا پڑ گیا۔ کیپشن فریڈ نے اسی لمحے کے اندر اندر گارڈ کی وردی پسندی اور وہ چاروں اسی لمحے میں ہمارے تبعے سے بست دودر نسلک لگئے۔

احتیاط در احتیاط۔ پھنڈ در پھنڈ۔

بارود، بندوقیں، جوان، شیلنگز، ہیپیں، گٹے — پولیسی باشی ان کا کچھ بگاہ میکی کیوں مکہ اس لمحے میں فطرت، بدقسم انسانی کی مد میں نکلے ہوئے مجرمے اور رفقاء المی بندھی۔ اس واقعہ کے بعد مہر گھنکہ کمپیوں میں جوان، رینکس، آئیپس اور جی اسی کے لوگوں کی ساخت

عینہ عیحدہ نظر بندیوں میں منتقل کر دیتے گئے۔

اس ایک لمحے میں جب ہم صدیوں کا سفر کر رہے تھے۔ ہم باقی چار آدمی سنٹے میں صرف نہیں  
کے سارے زدم تھے۔ سانسوں کی آواز اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ ہمیں یور گلنا خوبی ہے کوئی تکمیل  
بیٹھا اپنی بُٹھی جلا رہا ہے۔ ہم سب کے چہرے گوارڈ کے حکم سے لپٹی ہوئی چادر کی طرح سفید تھے۔  
صرف عبدالکریم اسی طرح تھا۔

وہ کہیں فریب کے ساتھ کئے ہوئے دعا سے کے مطابق اونچے اونچے سٹی بجارتا تھا۔ اسکی  
سیٹی میں ذرہ بھر خوف نہ کش و شبہ اور ابتلاء کی شکل نہ تھی۔ اسی سیٹی ایسے اجائے کہ رہی تھی جیسے  
کان کی کوپی کے ساتھ گلی مارچ اندر ہی سے پہاڑ میں راستہ دکھار رہی ہے۔  
عبدالکریم پورے پونے تین بنے تک سیٹی بجارتا تھا۔  
اور پورے تین بجھے ہر منی کھنہ تلاشی لینے ہوئے ہے جب میں آیا۔  
میری دردی کھوئی کے ساتھی ہوئی ہوئی ہے۔  
اس پر جا بجا حلیب کے سیاہ پر کٹے سے نشان میں۔

ہم لوگ کون میں؟  
ہم لوگ ہر دشمن کی قید میں رہے۔  
ہم لوگ کون میں؟  
ہم نہ غازی تھے نہ شہید۔

ہم نہ محب طن تھے نہ مرحد و لکھ پار کر جانے والے۔

ہم نے دشمن کی قید میں وطن کی محبت سکھا۔ مکروہ اور بے ہمت اُنکی کے پاس دوسرا سے  
ہوتے ہیں۔ یادہ رو تاہے یا بیگ جاتا ہے۔ ہم کمزور تھے لورڈ رومسکٹ تھے اور نہ ہی بھاگ  
سکتے تھے۔ دشمن ہمیں بزرگ سمجھنا تھا اور ہمارے اپنے دلیں کے دانشور ہمیں یالم، انسانیت کش  
اور زان بگھتتے تھے۔ اپنوں کے ان زماں ہزاروں میں کام سفر کے دور از میرزا ٹلوں کی طرح ٹھیک ٹھیک